دھند میں لپٹا جنگل



احمد حسین مجاہد

''دھند میں لپٹا جنگل'' احمد حسین مجاہد کی غزلوں اور نظموں کا خوب صورت مجموعہ ہے۔اس کے مطالعے سے ثابت ہوتا ہے کہ ان شعری تخلیقات کے عقب میں ایک جیتا جاگتا باشعور ذہن، ایک نہایت درجہ حساس دل اور امکانات سے چھلکتا ہوا ایک وجدان کارفرما ہے۔مجاہد کا یہ پہلا مجموعہ کلام ہے مگر یہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ان کا بھرپور مستقبل پوری آن بان سے جھلکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔وہ شاعری کی دونوں اصناف، غزل اور نظم پر استادانہ حد تک حاوی ہیں اور ان کے ساتھ آنے والے دور کی بہت سی توقعات وابستہ کرتے ہوئے اہل ذوق کو کوئی جھجھک محسوس نہیں ہو سکتی۔

احمد ندیم قاسمی

تمہاری تازگی اور زبان پر کنٹرول نے متاثر کیا۔تم میں ایک اچھے شاعر نے بسیرا کیا ہے، اِس کا خیال رکھنا۔

ساقی فاروقی

''دھند میں لپٹا جنگل'' پا کر مجھے اس باپ جیسی خوشی نصیب ہوئی ہے جسے برسوں ترسنے کے بعد اولاد نصیب ہوئی ہو۔

قتیل شفائی

احمد حسین مجاہد کا شمار ہمارے بعد کی نسل کے نمائندہ ترین شعرا میں ہوتا ہے۔

امجد اسلام امجد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دُھند میں لپٹا جنگل

دُھند میں لپٹا جنگل

احمد حسین مجاہد

اہتمام پبلی کیشنز، ایبٹ آباد

کتاب : دُھند میں لپٹا جنگل

شاعر : احمد حسین مجاہد

طبع اول : ۱۹۹۷

ای ایڈیشن : ۲۰۲۲

کمپوزنگ : وجدان

ناشر : اہتمام پبلی کیشنز

ایبٹ آباد

0332-9461234

قیمت 700 روپے

اہتمام پبلی کیشنز۔ ایبٹ آباد

والدِ محترم

غلام حسین بیکس

کے نام

ازل سے ہے یہی دستور بیکس حسن والوں کا

جسے اپنا بناتے ہیں اسے برباد کرتے ہیں

غلام حسین بیکس

’’دہانِ زخم میں آخر ہوئی زباں پیدا‘‘

غالب

ترتیب

نظمیں

غزلیں

نظمیں

غزلیں

نظمیں

غزلیں

غزلیں

نظمیں

غزلیں

نظمیں

مجاہد کی شاعری، جنگل میں ایک راستہ

آصف ثاقب

احمد حسین مجاہد کی شاعری بادِ شمال کی چبھتی ہوئی تربیتوں سے جوان ہونے والے کے دکھوں کا ثمرہ ہے۔ جھولتی شاخ کے پتوں کی گنگناہٹوں سے مزین غزل، دردِ نظارہ کی سرخیوں سے خوش بدنی لے کر آ موجود ہونے والی نظم، اس کی شدتِ احساس کی ہمنوا ہوتی دیکھی جاتی ہے۔ کہیں فکر خوش وضعیِ فن کی ندرتوں سے ہم کلام ہے، کہیں کوتاہیِ فن خلوصِ جذبہ کی گواہ۔

جب پہاڑوں کی چوٹیوں سے مرغِ زریں کی پھڑ پھڑاہٹ دریا کی موجوں کو بے چین کر دیتی ہے، احمد حسین مجاہد اس ہیجان کو دل میں قید کر لیتا ہے۔ اس قیدی کو جذبے کی نرم سیری کا لہجہ سکھا کر غزل کے سفر میں منعکس کر ڈالتا ہے۔ پھر جنگل کی ویرانیوں سے ہم قدم ہو کر

پُر پیچ پگڈنڈیوں کا سفر اسے بھلا لگتا ہے۔محسوسات کی انوکھی مگر خوش آئند تمثیل اسے باامید و بامراد رکھتی ہے، وہ کہتا ہے

کبھی محسوس کرتا ہوں جب اس کا ہاتھ شانے پر
مجھے لگتا ہے جنگل میں کہیں اک راستہ بھی ہے

یوں دیاروں، پہاڑوں اور پیڑوں کے درمیان تاریکی میں یہ شب زدہ مسافر کربِ شعری کے چراغ جلائے چلتا جاتا ہے۔اس کرب کی تجسیم ''جنگل میں کہیں اک راستہ بھی ہے'' جیسے بیانیہ میں مصور ہے۔یہی تجسیم برنگِ تمثیل اس کی ساری شاعری کا حسنِ اختصار بھی ہے۔

احمد حسین مجاہد ذاتی اور غیر ذاتی امکانات کے تصرف میں اس قدر عرق ریز ہے کہ مطالعہ و مشاہدہ کی گہرائی دقتِ نظر کی شہادتیں دینے لگی ہے۔طبیعت سامانِ تغزل کی شعوری مگر دل پذیر بہم رسانی مین ایسی شاد و آباد ہے کہ خود اس کو اور سامنے والوں کو'' قامتِ غزل'' دل کے اندر قدم جمائے کھڑی اچھی لگتی ہے۔غزل کے پیار دلار میں مجاہد نے پہلے ردو قبول کے ڈھیر لگائے، پھر اس جد و جہد سے خود کو پہچان کا مجاہد کیا۔

تب کہیں اپنا آپ پہچانا
خود کو احمد کیا ہے رد برسوں

مجاہد بالاکوٹ، اپنے مسکن کی زمین کی باس کو خون کی رنگینی میں شامل کر کے شعر ساماں ہوتا ہے۔اس سرزمین کا ماضی مجاہد کے ذہن ودل کے منور گوشوں میں حال کا سورج بن کر چمک رہا ہے۔اسی تفاخر،اسی محبت نے نسبت وہاں استوار کر رکھی ہے جہاں شفاعتوں ،عنایتوں کے خزانے مہیا ہیں۔ یہ بہار نصیب ہی سے ملتی ہے۔مجاہد کا شعر دیکھیے !

مصطفیٰ کا نام میں نے بادباں پر لکھ دیا
تند موجوں سے لڑے گا اب سفینہ دیکھیے

تیقن اور ارادتِ قلبی کی مثال شاید ڈھونڈے سے کہیں اور بھی مل جائے مگر اس کی اپنی انفرادیت ہے کہ اس شعر میں بالاکوٹ کی تاریخ بولتی ہے۔اسی تناظر میں ایک اور شعر!!

امکان کے فسوں سے عبارت ہے کائنات
ہر چیز ایک وہم ہے لیکن یقیں ہے عشق

یونہی بات زبان پہ آ گئی،احمد حسین مجاہد ''اثر پذیری'' کے بے جا ورود سے دامن کشاں رہے تو یہ اس کی غزل پر احسان ہوگا۔روایت اور جدت کا حسن زامیل اس کے اختیار سے باہر نہیں۔تازہ کاری،اظہار یہ خوش گواری،خیال کے نئے نئے زاویوں،فکر کے نئے نئے آئینوں سے جھلک رہی ہے۔تفہیم میں عقلیہ کاوشوں کا زور نہیں لگتا بلکہ ناوکِ سخن دل پر ٹھیک بیٹھتا ہے۔''نئی غزل'' کے جوان خون کا اہتمام،احمد حسین مجاہد نے اپنے شعروں میں بدرجۂ

حسن وخوبی کررکھا ہے۔اس کا آنسو آنسو لفظ میں جلتا بجھتا ہے۔اس کی سسکی، کسک کسک روتی بولتی ہے۔ یہاں دو شعر کفایت کر جائیں گے۔

سوچے جو وہ تو اس کی سخاوت پہ طنز ہے
کاسہ بدست شخص کا خیرات سے گریز

مرے سوا بھی کوئی ہے جو سوچتا ہے مجھے
بٹا ہوا ہوں میں دو مختلف دعاؤں میں

بہت کم شاعروں نے بیک وقت غزل اور نظم کے حقوق بطریقِ احسن ادا کیے ہیں ۔اقبال کے قائم کردہ معیار کا منہ چوم لینا تو درکنار، اس کا دامن پکڑ لینا بھی مشکل دکھائی دیتا ہے۔ بہرآئینہ نظم و غزل کو یکساں معیار سے برتنے میں کچھ ''خوش قلم'' اسم رکھتے ہیں ۔ادھر احمد حسین مجاہد کے مزاج میں نظمیہ عوامل کی فراوانی ہے۔کبھی کبھی نظمیہ صورتیں اس کے غزلیہ پیکروں پر آن لگتی ہیں۔ بہرنوع جیسے کہ پہلے کہا گیا ہے کہ مجاہد تغزل کے آثار جمع کرنے میں کامیاب ہے۔اس موقع پر یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ تغزل کی مشاطگی میں وہ جمیل ارادوں سے استفادہ کرتا ہے۔ یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ وہ بہتر غزل گو ہے یا نظم نگار، بہرحال آپ اس کے نظمیہ ادراک کا اندازہ ان دو مثالوں سے لگایئے۔ نظم ''دسمبر لوٹ آتا ہے'' سے چند لائنیں۔

مجھے غفلت کی گہری گھاٹیوں میں
دفن کرنے کو
مری خوش فہمیوں کے آئینوں میں برف بھرنے کو
دسمبر لوٹ آتا ہے

نظم ''دعاؤں میں بٹا ہوا شخص''

ماں دعا کرتی ہے
بیٹا!
تو سدا زندہ رہے
وقت کی آغوش میں
ایسا کوئی لمحہ نہ ہو
جس میں تیری ذات کو
دنیا سے کوئی دکھ ملے
میں دعا کرتا ہوں
مولا!
ایڑیوں پر خون ہو
جس لاش کی
میری نہ ہو۔

احمد حسین مجاہد کی شاعری تہذیب و تدوین کے لامتناہی سلسلوں سے گزر رہی ہے۔اس شاعری میں امکانی خوبصورتیوں کی موجودگی تو ہے مگر گھاٹیوں اور پُر پیچ پگڈنڈیوں کے سفر میں بچ نکلنے کی ترغیبیں اور تاکیدیں بھی کہیں کہیں ملتی ہیں۔کامیابیوں، کامرانیوں کے ساتھ ان ترغیبوں اور تاکیدوں کو پیشِ نگاہ رکھا جائے تو فن کی بڑائی ہاتھ لگتی ہے۔حاصلِ کلام یہ ہے کہ مجاہد کی شاعری ہاڑ کی سخت گرمی میں اُمڈی ہوئی بدلی ہے، جو برس پڑے گی تو حدتِ وجود کو تھپیڑے بھی لگائے گی اور بوسے بھی دے گی۔



حمد

خیال و خواب کی حد سے ہے ماورا اللہ
مری نظر میں ہمیشہ مگر رہا اللہ

جو بات روح کی گہرائیوں میں خفتہ ہے
مجھے خبر ہے سمجھتا ہے وُہ مرا اللہ

مرے لبوں کو معطر ہَواؤں نے چوما
ہر ایک شے نے مرے ساتھ جب کہا اللہ



زمانہ دیکھ چکا ہے زمانہ دیکھے گا
کہ میرے ساتھ رہے گا سدا مرا اللہ

کچھ اِس ادا سے کیا خود کو پائمال احمد
جدھر بھی آنکھ اُٹھائی مجھے ملا اللہ



نعت

دل میں رکھتا ہُوں میں جلووں کا خزینہ دیکھئے
نورِ احمد سے ہے روشن میرا سینہ دیکھئے

کوئی کیا تصویر کھینچے گا وہاں کے نُور کی
اپنی آنکھوں سے کبھی جا کر مدینہ دیکھئے

مصطفیٰ کا نام میں نے بادباں پر لکھ دیا
تُند موجوں سے لڑے گا اَب سفینہ دیکھئے

میں محمدؐ کے غلاموں کی ہُوں خاکِ پا، مرا
زندگی کرنے کا اپنا ہے قرینہ دیکھئے

رباعی

اقبال کے افکار سے سرشار ہُوں میں
اور میر کے لہجے کا پرستار ہُوں میں
اسلوب، سخن میں ہے مرا اپنا ہی
یہ سچ ہے کہ غالب کا طرفدار ہُوں میں

تشکیلِ خدّ و خالِ اَنا عشق سے ہُوئی
ہستی فنا کے غَم سے وَرا عشق سے ہُوئی

اَربابِ اِختیار کو طاقت کا زعم تھا
میری مطیع خلقِ خُدا عشق سے ہُوئی

ہر لفظ کو نوید بقائے دوام کی
میرے سخن کی آب و ہَوا عشق سے ہُوئی

شفاف آئینہ ہُوئے اسرارِ کائنات
تنزیلِ فکر عُقدہ کشا عشق سے ہُوئی

باطل ہوئے طلسم تری اِک نگاہ سے
پتھرا گئی تھی سوچ، صدا عشق سے ہُوئی

سینہ یقیں کے تخم نے چیرا زمین کا
وہم و گماں سے عقل رہا عشق سے ہُوئی

احمد یہ زندگی ہے رہینِ خیالِ دوست
مجھ پر ہر ایک سانس روا عشق سے ہُوئی

بچھا ہے جسم میں بارود ہر طرف سائیں
بجز مرے، مرا کوئی نہیں ہدف سائیں

اِک اپسرا ہے اداسی کی خیمہ زَن مجھ میں
ہر ایک سانس ہے اُس ساحرہ کا دَف سائیں

عبارتوں میں نئے لفظ روح پھونکیں گے
میں حاشیے سے بھی ہَو جاؤں گا حذف سائیں

یہ اور بات کہ میں حد سے بڑھ گیا ورنہ
پگھلتی برف سے کس کو نہیں شغف سائیں

کھڑے ہیں دیکھنے سورج کی آخری کرنیں
عذابِ دید کے مشتاق صف بہ صف سائیں

تھوڑی دیر کو برف پہ سورج چمکا تھا
دریا میرے آنگن تک آ پہنچا تھا

نیم دلی سے دستک سی تھی میں نے بھی
اُس نے بھی دروازہ آدھا کھولا تھا

ماضی کی اِک لغزش کے آئینے میں
میں نے مستقبل کا چہرہ دیکھا تھا

دنیا جیسی شے تھی میری ٹھوکر میں
بیناؤں سے میں نابینا اچھا تھا

خوں جلنے کی بُو آتی ہے لفظوں سے
میں بھی جانے کیا کیا لکھتا رہتا تھا

احمد مجھ سے خائف ہے ہر سانپ اَب تک
اِک دن ماں نے میرا ماتھا چوما تھا

اَنا کی سخت چٹانوں میں راستہ کر کے
کیا ہے ایک خلا ختم دوسرا کر کے

نہ وُہ ہے اور نہ میں ہُوں کسی کے مطلب کا
مگر یہ لوگ رہیں گے ہمیں جدا کر کے

اُسے نہیں کوئی نسبت مرے قبیلے سے
جو زندگی کو گزارے ذرا ذرا کر کے

کوئی بہت ہی پُرانا حساب ہے جس کو
چُکا رہا ہے وُہ مجھ سے بہت وفا کر کے

ابھی ہے خلق کی بیعت کا مسئلہ باقی
میں مطمئن نہیں پتھر کو دیوتا کر کے

خوشبو ترے بدن کی ہے جھونکے خیال کے
رَچ بس گئے ہیں ذہن میں موسم وصال کے

مصرف نکل ہی آتا ہے بیکار چیز کا
لاتا ہُوں بھیک باپ کی پگڑی میں ڈال کے

اندر کے زلزلوں سے دراڑیں سی پڑ گئیں
کب تک رکھیں بدن کی عمارت سنبھال کے

راتوں کو چاند بن کے وُہ نکلے توَ دیکھنا
دن آ گئے ہیں اُس پہ بھی کتنے زوال کے

سقراط میرے عہد کا سولی پہ چڑھ گیا
مہلک ترین زہر کا پیالہ اچھال کے

احمد صدائے عشق میں کیسا طلسم تھا
چرچے تھے آسماں پہ اَذانِ بلال کے

اَن کہی کے سحر میں ہے نقشِ پا کوئی بھی ہَو
بھید ہے ردِّ عمل کا، سلسلہ کوئی بھی ہَو

ایک ہَم ہی تَو نہیں محوِ سفر اس سمت میں
سب کی منزل شہرِ شب ہے، قافلہ کوئی بھی ہَو

پھیر دیتا ہے دنوں کو درمیانِ خوب و زشت
ہے تغیر آشنا، اُس کے سوا کوئی بھی ہَو

بابِ حیرت مستقل وا ہے الجھتی فکر پر
آگہی کی زَد میں ہے صبح و مسا کوئی بھی ہَو

ہَم پہ ثابت سانس کر دَو تُم کوئی غم سے تہی
پھر ہمارے جرم کی چاہے سزا کوئی بھی ہَو

پیروں سے بھنور لپٹ گئے تھے
دریا میں چراغ جل اُٹھے تھے

اِک حرف نہ آسماں سے اُترا
ہَم تھے کہ کتاب مانگتے تھے

مٹی کو پسینہ آ رہا تھا
ہَم موت کی چال چل رہے تھے

شیشے کے گھروں میں بیٹھ کر ہَم
پتھر کی بلائیں لے رہے تھے

یہ جان کے دُکھ ہُوا ہے احمد
کچھ لوگ ہمیں بھی چاہتے تھے

پابہ گِل

مرے پاؤں اک لنگڑے گھوڑے کی
ٹیڑھی رکابوں میں ہیں
میری آنکھیں اُفق کے اُدھر
ایک نادیدہ دَف پر تھرکتی ہُوئی
اُنگلیوں پر جمی ہیں
فضا میں
مری فتح کے گیت کی

نکہتیں گونجتی ہیں

مرے ہاتھ کی پُشت پر

نرم ہونٹوں سے کوئی

محبت سے اِک فیصلہ لکھ رہا ہے

مجھے مرحبا کی صداؤں میں

کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا ہے

مری اِک جھلک کی تمنا میں

ہر پیکرِ آب و گِل

مست و سرشار ہے

میرے ہاتھوں میں ہے

وقت کی باگ، چاہے جدھر موڑ لُوں

میری اِس کامیابی پہ بوڑھی ہَوا

دَم بخود ہے

مگر میرے پاؤں۔۔۔

ابلاغ

مرے لہجے کی دھیمی آنچ سے
پتھر پگھلتے ہیں
مجھے قدرت نے لفظوں کو
برتنے کا ہُنر بھی بخش رکھا ہے
مگر پھر بھی
میں جب اپنے کسی
جذبے کا اُس کے ہر حوالے سے
مکمل طور پر ابلاغ کرنا چاہتا ہُوں
کچھ نہیں کہتا۔

ایک زخمی سوال

بچھا رکھی تھی چراغوں کی صَف سرِ مژگاں
اُس اِنتظار کی لذت بھی کیا قیامت تھی
مگر وُہ اور کوئی تھا کہ جس کی قسمت میں
تری وفا کی مہک تھی، تری رفاقت تھی

مرے لیے ہی نہیں ہیں محبتوں کے اَلم
ستم ظریفیِ قدرت کا ہیں شکار سبھی
ہر اِک کے زیرِ تصرف ہے دوسرے کا بھرم
ضرورتوں سے بندھے ہیں وفا شعار سبھی

یہ واقعہ ہے کہ اِک اور شخص کا محبوب
کہ جس سے اور کسی کو بہت محبت تھی
لپٹ کے مجھ سے جو سویا تو میں بہت رویا
خُدا کو اتنے تکلف کی کیا ضرورت تھی

دعاؤں میں بٹا ہُوا شخص

ماں دُعا کرتی ہے

بیٹا !

تُو سدا زندہ رہے

وقت کی آغوش میں ایسا کوئی لمحہ نہ ہَو

جس میں تیری ذات کو

دنیا سے کوئی دُکھ ملے

میں دُعا کرتا ہُوں

مولا ۔۔!

ایڑیوں پر خون ہَو جس لاش کی

میری نہ ہَو ۔

کچھ ایسے آسماں مرے شانے پہ آ گیا
اندھے کا پاؤں جیسے خزانے پہ آ گیا

اِس بار بھی شکست مرے وہم کی ہُوئی
اِس بار بھی وُہ میرے بلانے پہ آ گیا

نادیدہ ہاتھ میرے گلے تک پہنچ گئے
ہستی کا بوجھ جب میں اُٹھانے پہ آ گیا

موضوعِ گفتگو تھا مرا ہر اِک جگہ
میں گھوم پھر کے اپنے ٹھکانے پہ آ گیا

یہ سب کیا دَھرا ہے بس اِک شخص کا مگر
الزام بے گناہ زمانے پہ آ گیا

میں زندگی کے گہرے سمندر میں تیر کر
اندھے کنویں کے تنگ دھانے پہ آ گیا

اُس کا نیاز مند ہُوں اپنی مجال کے نثار
جس کا کوئی بدل نہیں ایسی مثال کے نثار

اور بھی لوگ تھے جنہیں عشق کا زعم تھا مگر
راہوں کی گرد ہو گئے کارِ محال کے نثار

اُس کا عروج مدعا، اُس کی خوشی عزیز ہے
اپنی شکست پر فدا، اپنے زوال کے نثار

ورنہ میں کس شمار میں ،ورنہ میں کس قطار میں
میں بھی ہُوں صاحبِ نظر،قحطِ کمال کے نثار

ہجر بھی ایک وصل ہے، وصل بھی ایک خواب ہے
جو بھی ہے اِس کے دَم سے ہے اپنے خیال کے نثار

قفس کی چُپ میں جو گھر کا فساد بولتا ہے
مرے وجود میں اِک سند باد بولتا ہے

سماعتوں کو کہیں زنگ ہی نہ لگ جائے
وُہ کم سخن بڑی مُدّت کے بعد بولتا ہے

پہنچ ہَوا کی نہیں قلبِ سنگ میں وَرنہ
مہک میں گُل کی مرا اِعتماد بولتا ہے

مرے عدو میں کہاں لَب کشائی کی ہمت
یہ سب تو اُس سے ترا اِتحاد بولتا ہے

قسم ہے عصر کی اِنسان ہے خسارے میں
ہر ایک رشتے میں اس کا مفاد بولتا ہے

روز آرزو کوئی میرے دل میں مرتی ہے
تُو نہیں سمجھ سکتا مجھ پہ کیا گزرتی ہے

شبنمی دیے رکھ کر پھول کی ہتھیلی پر
رات اور بھی مجھ کو بے قرار کرتی ہے

اِک عذاب ہوتی ہے رمز آشنائی بھی
مجھ سے میری تنہائی گفتگو بھی کرتی ہے

حال پوچھنے والے! اب میں کیا کہوں تُجھ سے
سانس لے رہا ہُوں میں، زندگی گزرتی ہے

جذب کی یہ کیفیت تا بکے کہ اَب دِل میں
اُس کے لمس کی خواہش ڈُوبتی اُبھرتی ہے

ذہن میں اُبھرتے ہیں خدّ و خال سے احمد
یاد سی کوئی میرے دِل پہ پاؤں دَھرتی ہے

برسا جو کشت ، جاں پہ وُہ بادل قیاس تھا
میں آج بھی اداس ہُوں، کل بھی اداس تھا

اُس کو کھٹک رہی ہیں محبت کی شدّتیں
جو سرسری سخن پہ سراپا سپاس تھا

اُس نے تَو مجھ کو زخم کی خلعت بھی دی مگر
میں تھا کہ ہر لباس میں ننگِ لباس تھا

مجھ سے تُو سر گراں ہے نشاطِ اَلم نواز
اِک میں ہی تھا جو تیرا مشیّت شناس تھا

احمد بزعمِ خود تھے سبھی سلسلے مرے
وُہ مجھ کو پا کے خوش ہے نہ کھو کر اداس تھا

سبھی پہ جس کا ہے عکس وُہ بے مثال دیکھا
نظر نہ تھی تو نظر کا میں نے کمال دیکھا

یہ میں تھا حیرت کے مرحلوں سے گزر کے میں نے
اُسی کی تخلیق ہو کے اُس کا کمال دیکھا

جو بے گھری میں بھی سب کی قسمت بدل رہی تھی
اُسی قناعت نے مجھ میں آ کر زوال دیکھا

یہ واقعہ ہے خیال اُس کو تب اپنا آیا
جب اپنے بارے میں اُس نے میرا خیال دیکھا

میں منفعل ہُوں طلب کے اِس اِرتقا پہ لیکن
وُہ خوش ہے اُس نے مرے لبوں پر سوال دیکھا

مراجعت کا سفر بھی کیسا سفر ہے جس میں
کبھی نہ دیکھے ہُوئے کا دِل میں ملال دیکھا

پلٹتی کرنوں میں ایسا اُلجھا کہ میں نے احمد
نہ اُس کو دیکھا نہ اُس کے شیشے میں بال دیکھا

خود رَو ہے مجھ میں اپنے مفادات سے گریز
دریا سے عشق اور مضافات سے گریز

مجھ بے ہُنر سے عشق نے منسوب کر دیا
اندھی عقیدتوں کے طلسمات سے گریز

سوچے جو وُہ تَو اُس کی سخاوت پہ طنز ہے
کاسہ بدست شخص کا خیرات سے گریز

کرتا رہا میں اُس کے تجسس کو دیکھ کر
کہنے کی تھی جو بات اُسی بات سے گریز

جھپکی ذرا جو آنکھ تو منظر بدل گیا
اَب میں ہُوں اور غَم کا مری ذات سے گریز

آکاس بیل

خوابوں کے گھونسلے میں اُتر آئی خامشی
آنکھیں بھری بہار میں مرجھا کے رہ گئیں
ہونٹوں سے رستے خون میں دُکھ رینگنے لگا
رَگ رَگ میں جَم گئی ہے دَمِ واپسیں کی برف
اَب سوچتا ہُوں میں کسی صحرا میں تو نہ تھا
کتنے گھنے درخت تھے قرب و جوار میں
پھر کس لیے میں اپنے حوالوں سے کٹ گیا
آکاس بیل بن کے میں خود سے لپٹ گیا

گلیات کی ایک شام

دُھند کے اُس پار
بستی کے مکانوں میں
دیے جلتے ہُوئے دیکھے
تَو جانے کن نگاہوں سے
کسی نے مجھ کو دیکھا تھا
کہ اَب تک
میری ساری زندگی میں دُھند پھیلی ہے
دیا اِک بھی نہیں جلتا۔

دسمبر لوٹ آتا ہے

میں سارا سال
چرخہ کاتتا ہُوں
خواب بُنتا ہُوں

میں سارا سال
ٹھہرے پانیوں سے
چاند کی کرنوں کو چُنتا ہُوں

میں سارا سال
اُس کا منتظر رہتا ہُوں جس لمحے
مرے سَر سے مری محرومیوں کی پوٹلی
نیچے اُترتی ہے

میں سارا سال
اُس کو سوچتا ہُوں جس کی مُٹھی میں
خُدا نے میرے مستقبل کی تتلی
قید کر دی ہے

میں سارا سال
وُہ کرتا ہُوں جو
کوئی نہیں کرتا

مسلسل کرب کی اِس قید سے
جب بھی رہائی کی
کوئی صورت نکلتی ہے
میں سارا سال
جس کو سوچتا ہُوں
اُس کی آنکھوں میں
مری خاطر کبھی جب بھی
کوئی مشعل سی جلتی ہے
تو ایسے میں اچانک ہی

مجھے غفلت کی گہری گھاٹیوں میں
دفن کرنے کو
مری خوش فہمیوں کے آئینوں میں
برف بھرنے کو
دسمبر لوٹ آتا ہے۔

احساسِ رقابت

تمہیں بھی اَب

تمہارے اور اپنے درمیاں

دیکھا نہیں جاتا۔

نامعتبر حوالہ ہیں میرے مشاہدات
دیکھی ہے میں روزنِ زنداں سے کائنات

پہلا مکالمہ ہے یہ میرا سکوت سے
اے ہجر یار! آج ہے کس معرکے کی رات

خود آگہی کا گزرا ہے مجھ پر وُہ حادثہ
سکتے میں ہیں ہر ایک سے میرے تعلقات

تعمیرِ نو ہے ذات کی اِک خوابِ دلفریب
میری تو روح تک ہیں کسی کے تجاوزات

احمد گناہگار ہُوں میں بے یقیں نہیں
دیکھے ہیں اپنے شانے پہ اکثر خُدا کے ہات

یوں اُس نے کیا درد سے دَو چار مجھے
اَب راہ بدلنا بھی ہے دُشوار مجھے

ہر گام پہ اُگتا ہے کوئی وہم نیا
آتی ہے نظر دَشت میں دیوار مجھے

وجدان کی آواز کا ابلاغ کروں
اے کاش کہ ہَو سہل یہ کردار مجھے

میں کیسے کسی لفظ کی توہین کروں
رکھنا ہے ہر اک شعر کا پندار مجھے

بدلے نہ مرے بعد یہ آئینِ وفا
احمد ہے یہی فکر سرِ دار مجھے

چلی وُہ مہکتی ہَوا آخرِ شب
قفس تھا نہ زنجیرِ پا آخرِ شب

مرے دستِ قدرت میں تھی اک خُدائی
مگر میں نہ اپنا رہا آخرِ شب

ترا لمس احساس سے ماورا ہے
مری روح پر یہ کھلا آخرِ شب

مرے غَم کی لپٹیں تھیں اُس کے سخن میں
نجانے وُہ کس دُھن میں تھا آخرِ شب

بدلنا پڑا مسئلہ اُس کو مجھ سے
ہُوا ایسا اِک معجزہ آخرِ شب

مرے بازؤں میں سمٹ کر وُہ احمد
گھڑی بھر سہی، سو گیا آخرِ شب

سمٹا تو اُس کا اور بھی شدّت سے آوازہ ہُوا
ہر عیب اُس کی ذات کا اُس کے لیے غازہ ہُوا

مجھ کو بھی اپنے آپ سے کرنا ہے سمجھوتا کوئی
یہ تو مجھے اُس شخص کی باتوں سے اندازہ ہُوا

وُہ تو فصیلوں کے اُدھر خود میں مقیّد تھا مگر
اُس تک رَسائی کے لیے میں چور دروازہ ہُوا

رَکھ دی گئی ہیں ضبط کی دیوار میں آنکھیں مری
جب ہَو چکا تعمیر میں، مجھ کو تَب اندازہ ہُوا

اِس سال تَو احمد مجھے کیا کیا میسّر تھا مگر
پچھلے برس کی راکھ سے چہرہ تروتازہ ہُوا

تمہارے غم سے وابستہ ہُوں یہ راحت بہت ہے
زوالِ عمر کے اِس عشق میں شدت بہت ہے

اُسی نے مجھ کو اِک افواہ سے خوشبو بنایا
وہی اِک پھول ہے جس سے مری عزت بہت ہے

مری رسوائیاں ہیں مجھ کو اِک اعزاز جیسی
مجھے اپنے بدن پر زخم کی خلعت بہت ہے

غمِ دنیا خریدے گا کوئی سستا کھلونا
شکستہ ہُوں مگر اَب بھی مری قیمت بہت ہے

بجا ہے کروفر میرا کہ احمد پاس میرے
سبھی کچھ کم ہے لیکن درد کی دولت بہت ہے

مجھے اِس زندگی میں زندگی کرنے کی احمد
اگر مل جائے تَو اِک سانس کی مہلت بہت ہے

اِک وہم سے میں نکلوں اِک راہ وُہ چل دیکھے
میں اُس کو پڑھوں احمد وُہ میری غزل دیکھے

اِس عشق کے جذبے کا اِبلاغ ہے ناممکن
ممکن تھے جو وُہ میں نے پیرائے بدل دیکھے

وجدان یہ کہتا ہے تنہائی نہ پگھلے گی
یہ رات اماوس کی سورج بھی اُگل دیکھے

خوشبو کو رَگِ جاں میں گھلتے ہُوئے سنتا ہُوں
ہے تابِ نظارہ تو پھر آنکھ مچل دیکھے

چہرے کی دراڑوں سے صدیوں کا سفر کر کے
اِک اَشک جو ٹَپکا ہے اَب رَدِّعمل دیکھے

دعویٰ ہے جسے احمد وُہ اپنی اَکڑ لے کر
دنیا کے کناروں سے اِک بار نکل دیکھے

کھلے کواڑ کو چھو کر گزر گئی آہٹ
پھر اُس کے بعد نجانے کدھر گئی آہٹ

کہاں سے لائی اُٹھا کے یہ کربِ وہم وگماں
کہاں پہ لا کے خموشی سے دَھر گئی آہٹ

نگل گئی مری تنہائیوں کو اِک پَل میں
مجھے کچھ اور بھی ویران کر گئی آہٹ

دیے دَھرے کے دَھرے رہ گئے منڈیروں پر
طلسمِ شَب کے کنویں میں اُتر گئی آہٹ

یہ واقعہ ہے میں عینی گواہ ہُوں اس کا
ملا وجود جب اس کو بکھر گئی آہٹ

پروین شاکر کے لیے ایک نظم

قضا تازہ غزل میں
اِک اچھوتے لفظ ہی کو
قافیہ کرنے کے دَرپے تھی
اِک ایسا لفظ جس میں
شدّتِ اظہار کے سارے قرینے ہوں
جسے ''خوشبوؔ'' نے اپنی
''خود کلامی'' میں شریکِ راز رکھا ہَو
جو سانسوں میں
جنم لیتی، اُدھڑتی آہٹوں کے کرب تک کا

اِک نئے پیرائے میں اِبلاغ کرتا ہو

قضا تازہ غزل میں

ایک ایسے لفظ ہی کو

قافیہ کرنے کے دَرپے تھی

سو اُس نے زندگی کی ہر لغت کو

چھان ڈالا

ہر مجسم لفظ سے سرگوشیاں کیں

اور پھر اُس کی نظر

''صد برگ'' کی اِک پنکھڑی پر

شبنمی بوسوں میں رقصاں

لفظ پر ٹھہری

اُسے اِک قافیہ سوجھا

قضا سے اِک غزل سَرزَد ہُوئی

لیکن

کسی کی کتنی غزلیں، کتنی نظمیں

نامکمل رہ گئی ہیں۔

A TOUCH OF POETRY

اَب تمہیں احساس ہوگا
کرب کیا ہے
کرب کا احساس کیا ہے
میں تو اِن لفظوں سے پہلے ہی بہت مایوس تھا
اَب تم بھی اپنے درد کا
اظہار کرنا چاہتے ہَو
تم بھی اپنی اَن کہی نظموں کا دُکھ سہنے لگے ہَو
کچھ نہ کچھ کہنے لگے ہَو ۔

کاش میں پیدائشی گونگا ہوتا

جی بھر کے تمہیں دیکھ لیا کرتا کہیں پر
اظہارِ محبت کا گنہگار نہ ہوتا
تم بھی مری چُپ چاپ محبت نہ سمجھتے
میں بھی کسی وعدے کا طلبگار نہ ہوتا

ایسا تو نہ ہوتا کہ مرا درد سمجھ کر
تم اپنے دل آویز خیالات بدلتے
ایسا تو نہ ہوتا کہ مرے نام کو سن کر
تم محفلِ یاراں میں چلی بات بدلتے

چُپ چاپ سلگتے ہُوئے بے رحم تقاضے
عریاں ہی نہ ہوتے تو کوئی بات نہ ہوتی
جتنے بھی ستم عشق صحیفے میں رقم ہیں
اُن سَب کے مقابل پہ مری ذات نہ ہوتی

امریکہ

مرے
ہمسائے کی چھت سے
کوئی اِس گھر میں اُترے گا
کبوتر کے لہو سے
وُہ مرے آنگن کے اُجلے پھول
سارے
سُرخ کر دے گا۔

تجھے کھونے کا دُکھ بھی، چار جانب اِک خلا بھی ہے
مگر میں سانس لیتا ہُوں تو جنگل گونجتا بھی ہے

عجب مجموعۂ اضداد ہُوں میں بھی مرے مولا
بتوں سے بھی تعلق ہے، تری حمد و ثنا بھی ہے

زوال ِ عمر تک کا یہ سفر تو رائیگاں نکلا
کوئی اے جستجو میری ! کہیں میرے سوا بھی ہے

کبھی محسوس کرتا ہُوں جب اُس کا ہاتھ شانے پر
مجھے لگتا ہے جنگل میں کہیں اِک راستہ بھی ہے

ذرا سی بات حائل ہے ہمارے درمیاں احمد
ذرا سی بات کے پیچھے مگر اِک واقعہ بھی ہے

ایسا بے مہر نہیں ہُوں کہ بھلا دوں خود کو
آئینہ سامنے آئے تو صدا دوں خود کو

میرے منصب کا تقاضہ ہے محبت غَم سے
کیسے دنیا کے تعاقب میں لگا دوں خود کو

خاک کے نقش اجاگر تو کسی صورت ہوں
بے سبب کیسے ترا خواب بنا دوں خود کو

اُس کی باہوں میں سمٹنے کی سبیلیں ہیں کئی
اپنے رستے سے اگر اَب بھی ہٹا دوں خود کو

ہر مسافر کو ندامت ہو سفر پر اپنے
بیٹھے بیٹھے ہی کچھ ایسے میں تھکا دوں خود کو

اپنے پیروں سے زمیں کو میں دھکیلوں پیچھے
اور پھر گہرے سمندر میں گرا دوں خود کو

معلوم کے ملال سے آگے کہیں ہے عشق
جس پر ہے اتنا زعم ہمیں وُہ نہیں ہے عشق

امکان کے فسوں سے عبارت ہے کائنات
ہر چیز ایک وہم ہے لیکن یقیں ہے عشق

رکھ اِس میں مُشتِ خاک قدم احتیاط سے
ارواح کے خمیر کی طیب زمیں ہے عشق

نکلے نہ اپنی ذات کے گرداب سے کبھی
خود سے اگر نہیں تو کسی سے نہیں ہے عشق

اظہار کے لیے جسے کر لے یہ منتخب
بعد اَز فنا بھی اُس کی بقا کا اَمیں ہے عشق

سب ،جذبوں کی شدّت کے بیوپاری نکلے
سیدھے سچے لوگ بھی کاروباری نکلے

میں سورج کی پیاس لیے لوٹ آیا ہُوں
دریا آنکھ کا دھوکا،چشمے کھاری نکلے

مجھ کو زعم تھا لفظ مرا سرمایہ ہیں
لیکن لفظ تو جاں لیوا بیماری نکلے

میں مجذوب شکست جب اپنی مان چکا ہُوں
جس سے اَب چاہے اُس کی یاری نکلے

یار کوئی جب آ جائے عیاری پر
ایک اکیلا سو دُشمن پر بھاری نکلے

اُس سے جدا ہونا ہے مجھ کو لیکن ایسے
جسم سے جیسے روح بصد دُشواری نکلے

اُس کے مجھ سے جتنے بھی تھے رشتے احمد
وقت پڑا تَو سَب کے سَب بازاری نکلے

کوئی اسمِ ربِّ کعبہ کہ یہ وقت رُک گیا ہے
میں وہاں پہنچ گیا ہُوں جہاں ہر طرف خلا ہے

مجھے یہ گمان گزرا کہ میں جس کی کھوج میں ہُوں
وُہ سفر کی ابتدا سے مرے ساتھ چل رہا ہے

یہ مقام جس پہ میں ہُوں جسے دے یہ شرط رَکھ دے
جو نظر نہ آ رہا ہَو تجھے وُہ بھی دیکھنا ہے

میں کہیں کِل نہ جاؤں جو ذرا وُہ آنکھ جھپکے
وُہ جو مجھ میں چھپ کے مجھ کو ہمہ وقت دیکھتا ہے

جسے کر نہ پائے سورج وہی کام ہَو دیے سے
اے مرے خرد زدہ دل یہ مقام فکر کا ہے

میں سبھی سے مختلف ہُوں سو اِسی لیے تَو احمد
جو کہیں نہیں ہے اُس کا مجھے غَم عطا ہُوا ہے

زندگی کم ہَو رہی ہے ،عمر بڑھتی جارہی ہے
لمحہ لمحہ وقت کی چادر سکڑتی جا رہی ہے

میں بلندی سے نشیبوں کی طرف بہنے لگا ہُوں
اور دُنیا ہے کہ میرے سَر پہ چڑھتی جا رہی ہے

ذرّے ذرّے کے بدن سے منزلیں اُگنے لگی ہیں
یہ زمیں تَو پاؤں میرے اَب پکڑتی جارہی ہے

میں سماعت کا شکستہ دام پھیلائے ہُوئے ہُوں
میری بینائی اَب ان آنکھوں سے جھڑتی جا رہی ہے

میں تو کب کا دستکوں سے دست کش ہو بھی چکا ہُوں
اَب ہَوا کی سانس بھی احمدؔ اُکھڑتی جا رہی ہے

سائے میں اِک ریت کی دیوار کے
چل پڑے ہم گھر جوئے میں ہار کے

اِک گھڑے کی آس پر اِک عمر تک
خواب دیکھے ہَم نے دریا پار کے

دوستوں کی گفتگو کا حسن ہیں
چند پتھر وادیِ کنہار☆ کے

☆وادیِ کاغان کو دریائے کنہار کی نسبت سے وادیِ کنہار بھی کہا جاتا ہے

رنجشیں ہیں سُود،خواہش اصل زر
ضابطے سَب طے ہیں کاروبار کے

کار ِ دنیا میں لگیں وُہ ٹھوکریں
پیچ سارے کھل گئے دستار کے

ختم ہَو جائیں گے سارے سلسلے
بیٹھ جائیں گے کہیں تھک ہار کے

غالب

گرہ کشائیِ اسرارِ کائنات میں گُم
ورائے حدِّ بیاں حسن کی صفات میں گُم
صریرِ خامہ نوائے سروش ہَو جائے
خیال اُس کے طلسمِ بیاں میں کھو جائے
حصولِ منصب و رتبہ نہ تھا شعار اُس کا
قلندروں کا سلیقہ تھا افتخار اُس کا
جو بادشاہ تھے اُس شخص کے غلام ہُوئے
مقام اُس کی تمنا میں بے مقام ہُوئے

انسان

عقدہ کوئی نہیں جسے انساں نہ حل کرے
انسان تو خلیفہ ٔ پرودگار ہے
ہرشے ہے اس کے زیرِ تصرف زمین کی
یہ ثبت کر چکا ہے ستاروں پہ نقشِ پا
یہ جانتا ہے مقصدِ تخلیقِ کائنات
اسرارِ کائنات بھی اس کی نظر میں ہیں
تسخیر کر رہا ہے خلاؤں کی وسعتیں
چرخِ کہن بھی اس کی کمندوں کی زد میں ہے
غافل نہیں سکوت کے اُجلے کلام سے
انسان بے خبر ہے تو اپنے مقام سے

میں تَو کچھ بھی نہیں

میرے نوحے ہَوا بُرد ہوتے رہے
میری مٹھی میں سورج پگھلتا رہا
میرا ماضی مرے ساتھ چلتا رہا
میں رگڑتا رہا پتھروں پر جبیں
میں تَو کچھ بھی نہیں
جن کو اُس نے عطا کی کلاہِ خرد
اُن کے سینوں کے محراب خالی رہے
پھر بھی زر کے پجاری مثالی رہے
مجھ کو بخشا گیا صرف ذوقِ یقیں
میں تَو کچھ بھی نہیں

خاکِ دہلیزِ مقتل پہ میرا لہو
جم گیا تو مجھے میری ہستی ملی
آگہی کس قدر مجھ کو سستی ملی
اَب کوئی مجھ میں شعلہ بجاں ہے کہیں
میں تو کچھ بھی نہیں

جس نے صحرا میں دی ہے اذانِ جنوں
جس نے چشمِ فلک میں لہو بھر دیا
جس کے جی میں جو آیا وہی کر دیا
مجھ میں گُم تھا اَزَل سے یہ گوشہ نشیں
میں تو کچھ بھی نہیں
میں تو کچھ بھی نہیں

جدائی تو یقینی تھی

جدائی تو یقینی تھی
کہ رشتہ چاہے کوئی ہو
کسی احساس کی خوشبو سا دھیما
دُھند سا ہلکا
پہاڑی گیت سا پیارا
سمندر سا بہت گہرا، بہت بے اَنت
رشتہ چاہے کوئی ہو
ضرورت ایسی وحشی شے ہے
جو انسان کے اِک عمر کے آدرش
پل میں راکھ کرتی ہے

ضرورت ہَو تو ذرّے میں
خدا کو دیکھتے ہیں ہَم
ضرورت ہی نہ ہَو تو
معجزے بیکار جاتے ہیں
جدائی تو یقینی تھی
کہ اَب اُس شخص کو میری نہیں
کچھ اور لوگوں کی
ضرورت تھی۔۔۔۔!

احمد فراز کے نام

صدف میں گہر تو مکیں دیکھنا
جو ہَم دیکھتے ہیں، نہیں دیکھنا

کسے ناز ہے دعویٰ ِ کفر پر
فقیہانِ مسند نشیں! دیکھنا

ریا کا کوئی داغ دھبہ نہیں
کبھی ملحدوں کی جبیں دیکھنا

نگل ہی نہ جائے سماوات کو
کسی دن یہ اپنی زمیں دیکھنا

اِس انجان رستے میں کوئی اگر
بلائے تو مُڑ کر نہیں دیکھنا

بیٹھا ہُوا ہے کوئی اَب ایسے زاویے پر
اُس کی نظر ہے میرے اِک ایک ثانیے پر

مدّت گزر گئی ہے اِس حال میں کہ میرے
اِک ہاتھ میں دیا ہے، اِک ہاتھ ہے دیے پر

خوشبو میں ڈھل گیا جب سارا وجود میرا
اِس بے وفا ہَوا نے اپنے تو سی لیے پر

نادم ہُوں اَب تَو میں بھی ردِّ عمل پہ اپنے
پچھتا رہا ہے احمد وُہ شخص بھی کیے پر

کھاتا ہُوں جھوٹے لقمے، غالب کی شاعری کے
میری گزر بسر ہے احمد لیے دیے پر

چلی ہے بحث یہ خود ساختہ خداؤں میں
ٹٹولتا ہُوں میں آنکھوں سے کیا خلاؤں میں

ترے یقین کی تہذیب کو پلٹ آیا
میں اپنے شک کی تقدس بھری فضاؤں میں

مرے سوا بھی کوئی ہے جو سوچتا ہے مجھے
بٹا ہُوا ہُوں میں دو مختلف دعاؤں میں

خبر نہ تھی کہ جو دنیا ہے میری ٹھوکر میں
شمار اِس کا بھی ہونا ہے اپسراؤں میں

یہ کائنات اچانک سکڑ گئی احمد
بکھر گیا میں سمٹتی ہُوئی فضاؤں میں

جذبوں کے ابلاغ میں سچا لفظ ہُوں میں
بھید بھری آنکھوں سے گہرا لفظ ہُوں میں

جس میں غَم کی خوشبو صاف دکھائی دے
ایسی ہر تحریر کا پہلا لفظ ہُوں میں

سَب احباب پہ واجب ہے تعظیم مری
عشق کتاب میں دُکھ کا تنہا لفظ ہُوں میں

مجھ پر گونگی اُنگلی ہے اِک اَندھے کی
دنیا کیسے جانے کیسا لفظ ہُوں میں

اپنی روح پہ کندہ کر اے دوست مجھے
ماں کی ممتا جیسا پیارا لفظ ہُوں میں

صدیوں بعد بھی احمد وقت کے ہاتھوں سے
جو متروک نہ ہَو اِک ایسا لفظ ہُوں میں

کیسی یہ ابھی ہَوا چلی ہے
مجھ میں بھی دراڑ آ گئی ہے

" آنکھوں سے لہو ٹپک رہا ہے"
صحرا کو زبان مل گئی ہے

رَگ رَگ میں ہیں مکڑیوں کے جالے
دیمک سی بدن کو چاٹتی ہے

معلوم نہیں یہ زندگی کیوں
رہ رہ کے اُسی کو سوچتی ہے

آواز کبھی جو دی تھی خود کو
تا حد ِ نظر بکھر چکی ہے

اظہار پہ جب نہیں ہے قُدرت
کس کام کی پھر یہ آگہی ہے

میں ہُوں کُن فکاں کے ضمیر میں مری واردات میں عشق ہے
مرے قول و فعل ہیں ایک سے مرے شش جہات میں عشق ہے

کہیں نقشِ پا کا فریب ہے ،کہیں آہٹوں کا طلسم ہے
میں ہُوں فکر و فقر کی راہ میں ،مری بات بات میں عشق ہے

کسی معجزے کے ہیں منتظر جو روایتوں کے اسیر ہیں
مری زندگی ترے دَم سے ہے،مری کائنات میں عشق ہے

یہ ہجوم سا ہے جو دشت میں،کوئی اِس میں اہلِ سفر نہیں
نہ کسی کے پاؤں میں آبلہ نہ کسی کی ذات میں عشق ہے

میرا وجود صرف نہ ہونے کا ڈَر نہ ہو
جو آگ زیرِ پا ہے وہی معتبر نہ ہو

میں نے کہا نہ تھا کہ پلٹ راہِ شوق سے
اے مشتِ خاک ! دیکھ مری ہمسفر نہ ہو

تجدیدِ قُرب اَب کے اگر ہو تَو اے خدا
جو سانحہ ہُوا تھا وُہ بارِ دگر نہ ہو

مت کھول اُس پہ غَم کے صحیفے کا ہر وَرَق
شدّت جو اِس طرف ہے وُہ شاید اُدھر نہ ہو

تُو وُہ کڑی چٹان جہاں برف پڑ گئی
میں وُہ کہ جس سے ریت کا ٹیلہ بھی سر نہ ہو

رَکھ دیں سوادِ زخم پہ یوں اُس نے اُنگلیاں
جیسے کہ میرے زخم کی اُس کو خبر نہ ہو

اِس کاروبارِ اوج و عداوت میں ایک دن
ایسا نہ ہو کہ سر میں اُٹھاؤں تو سر نہ ہو

کیا ہوگا سوچ سوچ کے شَل ہُوں اَزَل سے میں
احمد جو ہر کہیں ہے، کہیں بھی اگر نہ ہو

مرادُ کھ

مرادُ کھ

یہ ہے مجھ کو

مانگنے کے بعد بھی

حسبِ ضرورت

کچھ نہیں ملتا۔

جھیل سیف الملوک پر

دُھند، جنگل، برف، بادل
بولتی خاموشیاں
آسماں پانی کے اندر
دُور تک اُترا ہُوا
جھیل کے چاروں طرف
خودرو گلابوں کی مہک
بیچ میں اِک آئینہ
اور آئینے میں اِک دھنک

کوہساروں سے اُترتی

صبح کی پہلی کرن

دیوتاؤں کا تبسم

دیوتاؤں کا سخن

پھول کی آغوش میں

شبنم کا پاکیزہ بدن

قاف کی پریوں کی باہم

نرم سی سرگوشیاں

بانسری کی دُور سے

آتی ہُوئی مدہم صدا

اِک پہاڑی گیت کے

معصوم جذبے کی طرح

میں اُسے محسوس کر کے

دیر تک کھویا رہا۔

دیرآئید۔۔۔۔۔

اِک ایسا وقت آنا ہے
اِک ایسا وقت آئے گا
کہ جب صحرا میں چشمے
جنگلوں میں راستے ہوں گے
تری بنجر نگاہوں میں
لہو کے پھول مہکیں گے
تری نیندوں کی چوکھٹ پر
ہمارے خواب چہکیں گے
اِک ایسا وقت آنا ہے

کہ جب تو اپنے ہاتھوں کی
کئی بجھتی لکیروں میں
کسی مبہم عبارت کا
کوئی مفہوم ڈھونڈے گا
مگر ہَم عین اس لمحے
کسی ویران بستی میں
کسی وحشی حقیقت سے
شکستہ ذات کے ریزے
چھپائے پھر رہے ہَوں گے
اُٹھائے پھر رہے ہَوں گے
اِک ایسا وقت آئے گا
اِک ایسا وقت آنا ہے

اپنے جیسے لوگوں کا دُکھ

یوں لگتا ہے
ہَم دونوں سے پہلے بھی ہَم دونوں جیسے
لوگ یہاں پر آئے ہیں
نقلی سونے کا یہ کنگن
ٹوٹی چوڑی کے بدلے میں پایا ہوگا
مٹی کے اِس ٹیڑھے میڑھے برتن میں
اِک دوجے کا جھوٹا
سَچے ،سُچے لفظ ملا کر
کھاتے پیتے ہَوں گے
تھوڑی دیر کی چُپ کے بعد

جو پہلے ہنستا ہَو گا
وُہ دوجے کے بالوں میں اپنے ہاتھوں سے
کنگھی کرتا ہَو گا
(بالکل جیسے ہَم کرتے ہیں)
ہَم دونوں سے پہلے بالکل ہَم جیسے
جو لوگ یہاں تھے
کیا اُن کا انجام ہُوا، یہ کون بتائے
اِس ویران جگہ پر ہَم ہیں، سناٹا ہے
زنگ لگی کچھ یادیں ہیں
یا اپنے آپ میں گُم یہ ڈھلتے سائے
کون بتائے؟

آنکھ کو اِک خواب کی زنجیر سے باندھے ہوئے
دیکھنے ہیں مجھ کو منظر بارہا دیکھے ہُوئے

شوق تھا کتنا کہ گزرے پَل میں ساری زندگی
اَب یہ دُکھ ہے حادثے سَب وقت سے پہلے ہُوئے

جل رہا ہُوں تیرے غَم کی آگ میں اِک عمر سے
آسماں ہیں حدّتِ انفاس سے جھلسے ہُوئے

کن اچھوتے راستوں پر فکر ہے گرمِ سفر
لفظ ہیں سَب محوِ حیرت، رنگ ہیں بکھرے ہُوئے

ماورائے حدِ امکاں کر عطا کی وسعتیں
یہ ترے سارے کرم تو ہیں مرے سوچے ہُوئے

دُکھ کی چڑیوں نے مرے ہاتھوں پہ تنکے چُن لیے
کس طرح سمٹیں گے اَب بازو مرے پھیلے ہُوئے

یوں اُڑیں گے کل فضا میں آج کے پربت مزاج
روئی کے گالے ہوں احمد جس طرح دُھنکے ہُوئے

مرے شَل حوصلوں کی ڈوبتی نبضوں میں آ بیٹھی
زمانے ! تیری ہمّت جب محبت آزما بیٹھی

اِدھر سے کون گزرا ہے مثالِ موجہ ُ خوشبو
ابھی تک چومتی ہے ایک دُنیا نقشِ پا بیٹھی

مجھے مرہونِ لطفِ آسماں ہونے نہیں دیتی
مرے زخمی لبوں سے دُور دِل میں اِک دُعا بیٹھی

نکلنے ہی نہیں دیتی حصارِ ذات سے مجھ کو
مری گدڑی کے ہر پیوند پر میری اَنا بیٹھی

میں اس کے گرد اپنی سوچ کا فانوس رکھ دُوں گا
چراغِ بزمِ تنہائی کو دیکھے گی ہَوا بیٹھی

ٹوٹا نہیں طلسم سحر سے بھی رات کا
اَب تو گرہ سے کھول فسوں معجزات کا

جس سے بھی تیرا ذکر کروں ہنس کے ٹال دے
اوڑھا ہُوا ہے سَب نے کفن احتیاط کا

مشکیزہ بھر کے خون سے لایا سوئے خیام
نوکِ سناں پہ جم گیا پانی فرات کا

سورج کو برف کھود کے دریافت جب کیا
سر پر گرا پہاڑ مری اپنی ذات کا

معدوم سے اُمید بندھی واپسی کی جب
اُترا ہُوا تھا دُھند میں رستہ نجات کا

پتھر کی سیڑھیوں پہ جمے خون میں اُگا
منظر جو دیدنی تھا تری کائنات کا

محرومیوں کا میل ہے دُھل جائے گا کبھی
کھوٹا نہیں ہُوا ابھی سکہ حیات کا

کسی کو دیکھنے والی نظر بھی رکھتے تھے
سفر میں تھے تو ہتھیلی پہ سر بھی رکھتے تھے

اُسے تو خوف تھا بس چار گام چلنے کا
ہم اپنے دِل میں بچھڑنے کا ڈَر بھی رکھتے تھے

بچا رہے تھے ہمیں جس مرض کے ہاتھوں سے
اُسی کا شوق کئی چارہ گر بھی رکھتے تھے

ہمیں یہ زعم کہ اُجڑے ہُوئے ہیں ہَم اتنے
اُنہیں یہ رنج ، وُہ اس کی خبر بھی رکھتے تھے

کرن جو قلب میں اُتری دَھنک ہُوئی احمد
ہَم اپنے عجز میں ایسا ہُنر بھی رکھتے تھے

سمیٹ لُوں میں اگر کائنات ِ تنہائی
بکھیر دیں گے مجھے معجزات ِ تنہائی

نشیب میں وُہی گمنامیوں کے شعلے ہیں
قدم قدم پہ وہی پُل صراط ِ تنہائی

سراغ دیتی ہے فردا کا دُور تک مجھ کو
کبھی کبھی تو کوئی واردات ِ تنہائی

پِٹا ہُوا ہے مری ذات کا ہر اِک مہرہ
بچھی ہُوئی ہے ابھی تک بساطِ تنہائی

یہ میرا جسم ہے خیمہ جلا ہُوا احمد
یہیں کہیں ہے لہو میں فراتِ تنہائی

بینائی کے چولہے میں دَبی راکھ سے نکلا
میں کوکھ جلی آنکھ کی پوشاک سے نکلا

منسوب سمجھتا تھا جسے اپنی بقا سے
فردا کا وہی خواب مری خاک سے نکلا

محروم ہُوا خود سے میں ہَستی میں جب آیا
آگاہ ہُوا خود سے تو اَفلاک سے نکلا

قائم ہے تسلسل مرا معیارِ وفا سے
میں جس میں ہُوا جذب اسی خاک سے نکلا

میں جسم لیے پھرتا تھا کس زعم سے احمد
لے دے کے زرِ زخم ہی املاک سے نکلا

سکوتِ شَب ہُو یوں گویا کہ جاں بیمار میں آئے
لہو بہرِ سماعت دیدہ ٔ بیدار میں آئے

کسی دَستِ ہُنر کی شانِ استغنا کی حدّت سے
ہَم آب وِ گل میں خفتہ، معرضِ اظہار میں آئے

مرا خوش وضع میری زندگی میں اِس طرح آیا
کوئی سیاح جیسے گاؤں کے بازار میں آئے

ہَم ایسوں کوتو َ جچتا ہی نہیں اسراف سانسوں کا
کہاں سے وقت کے تیور تری رفتار میں آئے

چمن تک نارسائی کے اَلم کا کوئی سامع ہو
تو َ نغمہ بن کے یہ زنجیر کی جھنکار میں آئے

کہاں صورتِ گری ممکن ہے خوابِ وصل کی احمد
یہی کافی ہے اس کا تذکرہ اشعار میں آئے

موت کی شرط

اَزَل سے ہے
سرشتِ خاک میں
محدود کو بے اِنتہا کرنا
مگر ہَم نے
پنیری خواب کی آنکھوں میں بوئی تھی
بدن نے اہتمامِ آب و ِگل کی
شرط پوری کی
ہَوا کو کنجِ مژگاں سے
رہِ رسم ورسائی دی
لہو نے جسم میں

مزدوریوں کا کرب بھی جھیلا

مگر ہَم نے

پنیری خواب کی آنکھوں میں بوئی تھی

سَو آنکھیں خاک ہونے تک

ہمیں تعبیر کی فصلِ گراں مایہ کے سپنے

دیکھنے ہَوں گے۔

اندھی عقیدت

کیا خبر اُس کو
کہ اِن سارے گلابوں کا لہو
میرے باطن میں چھپا
کالا سمندر پی گیا

کنجِ لَب سے پھوٹتی
اس روشنی کو کیا خبر
ثبت ہے اُس کی عقیدت
پُشتِ دَستِ خار پر

وُہ تو بس یہ جانتا ہے
میں بہت معصوم ہُوں۔

تمثیل

چیر کر تیرگی کے سینے کو
مجھ تک آئی جو روشنی اُس نے
چھین لی مجھ سے میری بینائی

میلے لباس کی خوشبو

خواب چبھنے لگے ہیں آنکھوں میں
عرصۂ ہجر مختصر کر دے
اپنے ہونٹوں کی ایک جنبش سے
میرے ہر غم کو بے اثر کر دے
دھند میں آنکھ کا بھرم رکھ لے
دشت میں ہاتھ کو شجر کر دے
اپنے میلے لباس کی خوشبو
میرے سانسوں کی ہم سفر کر دے

جتنے بدن پہ زخم ہیں بھر جائیں دوستو
ہَم پر یہ سانحے بھی گزر جائیں دوستو

دیکھیں تو اک حریف نہیں شہر میں کہیں
سوچیں تو اپنے آپ سے ڈَر جائیں دوستو

اُس وقت کی تلاش میں گزری ہے زندگی
صدیاں جب ایک پل میں گزر جائیں دوستو

منکر نہیں ہیں وسعتِ دُنیا کے ہم مگر
اُٹھ کر اَب اِس گلی سے کدھر جائیں دوستو

آتا ہے ان سے فکر کی دُنیا میں انقلاب
سینے میں گھٹ کے خواب جو مر جائیں دوستو

رکھ دیے تیرے حضور کربِ وفا کے چراغ
یا رہے تیری اَنا یا رہیں میرے چراغ

میری ہے یہ آرزو ورطہ ٔ جذب و غنا
دل میں ترے جل اٹھیں میرے لہو کے چراغ

تیری گلی میں ہَوا سوچتی ہی رہ گئی
کیسے بجھیں گے بھلا صبح تک اتنے چراغ

وجہِ سخن بھی وہی، جانِ سخن بھی وہی
پلکوں پہ جس نے رکھ دیے گردِ سفر کے چراغ

تیری نظر سے تجھے دیکھ لوں بس ایک بار
حشر تلک پھر مرے جلتے رہیں گے چراغ

نے عشق کا شعور نہ دولت تھی درد کی
پھر بھی ترے فقیر نے گدڑی نہ گرد کی

گوتم ہُوں مَن کی شکتی مری کائنات ہے
جاگیرِ حرفِ حق ہے کسی اور مرد کی

جو اُس کے برف لہجے سے بھڑکی تھی روح میں
میں نے وُہ آگ خون کے چھینٹوں سے سرد کی

ٹک دیکھتے طلسم جو قالب میں ڈھل گیا
پھر تم نہ پوچھتے کہ کہاں عمر گرد کی

سوتے ہی خشک ہَو گئے باوصف زعم کے
احمد طلب نہ ختم ہُوئی پھر بھی درد کی

مسلط ہے ریا کاری کہ مجھ پر خوف طاری ہے
خزاں آلود چہرے پر تبسم اشتہاری ہے

گناہوں کے تقدس کی وکالت کر تو لی لیکن
مجھے احساس ہے اُس کا جو بازی میں ہاری ہے

نجانے کتنی صدیوں کی تھکن اوڑھے ہوئے گا
وُہ اک لمحہ جو ساری زندگی میں اختیاری ہے

معطل کر دیا ہے ذہن نے پھر بیمِ فردا کو
ابھی تک پا برہنہ اپسرا کا رقص جاری ہے

فسردہ دیکھ کر مجھ کو، دریچے کے قریب آ کر
خزاں کا چاند کہتا ہے ابھی تَو رات ساری ہے

مرے اندر ابھی وُہ آدمی زندہ ہے جو احمد
سلگتے سوچتے ویران لمحوں کا شکاری ہے

ماں زمیں! یہ زخم جو پنہاں ہیں تیری خاک میں
ایک دن پیوند ہوں گے سینۂ افلاک میں

کون جانے کس سمندر کا ہُوا ہے خوں یہاں
جذب ہوتا ہی نہیں ہے اب لہو اس خاک میں

دھند کے اُس پار کیا ہے اَب بتا سکتا ہُوں میں
زندگی گزری ہے میری ذات کے ادراک میں

ایک نقطے سے بھی کم وقعت سہی میری مگر
گم نہیں کرتا میں خود کو وسعتِ افلاک میں

رَکھ نہیں پاتی کوئی شے اصل اپنی برقرار
جب بھی اُس کا چاند چہرہ ہو قفس کے چاک میں

خواہشوں کو ماورائے جسم کرتا ہی نہیں
میں دبا رکھتا ہوں احمد سورجوں کو راکھ میں

عشق سے عشق، غم سے دوستی ہے
زندگی یہ واقعی اَب زندگی ہے

ہَو سکے تو گنگنا مجھ کو کبھی تُو
تیرے لہجے میں بلا کی تازگی ہے

میری ساری زندگی کا مسئلہ ہے
تیرے ماتھے پر تو اک سلوٹ پڑی ہے

مجھ میں دُنیا کے لیے ہے کیا کشش جو
میرے دروازے پر آ کر بھونکتی ہے

ڈھونگ ہے میری قناعت، صبر دھوکہ
سچ تو یہ ہے مجھ میں ہمت کی کمی ہے

بعد میں آئینہ بھی ڈھونڈے گا
اُس کے چہرے کے خال وخد برسوں

اَب جو گزرا تو جان سے گزرا
میں رہا اور میری حد برسوں

اک ذرا آسمان چھونے کو
اُس نے اونچا کیا قد برسوں

تب کہیں اپنا آپ پہچانا
خود کو احمد کیا رد برسوں

ناران میں ایک رات

ابھری ہُوئی تھیں چاند کے ماتھے پہ سلوٹیں
مجھ کو نہ اپنا ہوش نہ یاروں کا پاس تھا
سب مل کے گا رہے تھے جدائی کا ایک گیت
خیمے میں دَف بجا تو میں کتنا اداس تھا

المیہ

محبت ہے
محبت ہے
مجھے تم سے محبت ہے
بس اتنی بات کہنا
کس قدر دُشوار ہوتا ہے
بس اتنی بات ساری زندگی کا روگ بنتی ہے
بس اتنی بات سے سارے تعلق
ٹوٹ جاتے ہیں
جنہیں اپنا بنانا چاہتے ہیں
روٹھ جاتے ہیں۔

اپنے بارے میں ایک نظم

مصلوب ساعتوں کی امیں فکر دم بخود
ہونٹوں کی ہر دراڑ میں کائی جمی ہوئی
پلکوں پہ دائروں کے سفر کی سیاہ گرد
آنکھوں میں خوابِ وصل سے الجھے ہوئے عذاب
احساس جیسے نیند میں ڈوبی ہوئی تھکن
جذبے ہیں زمہریر کے پاتال میں گلاب
سانسوں کے رتھ پہ کرب ہے ہونی کے خوف کا
حلقوم میں ہے ریت سوادِ فرات کی
خوں کے سفید خلیے ہیں یرقان کے مریض
ہاتھوں کی انگلیوں میں ہیں جالے تنے ہوئے
پھر بھی لکھوں ضمیر کی آواز پر وُہ لفظ
جو خود مری سمجھ سے بھی بالا ہیں آج تک
باہر بھی اک خلا، مرے اندر بھی اک خلا
مجھ پر کبھی تو راز مرا کھول اے خدا !

SEE OFF

چلو اچھا ہُوا
میں
تم کو رخصت کرنے والوں میں نہیں تھا
میں اگر ہوتا
تو وُہ جو تم کو رخصت کرنے آئے تھے
انہیں اپنی اداؤں پر
مرا بے ساختہ پن دیکھ کر
شرمندگی ہوتی
چلو اچھا ہُوا۔۔۔!

تخلیقی سفر کے سنگِ میل

اردو

۱۔ دھند میں لپٹا جنگل
۲۔ سیف الملوک
۳۔ صفحہ خاک
۴۔ اوک میں آگ
۵۔ رموزِ شعر
۶۔ آصف ثاقب، شخصیت اور فن

ہندکو

۱۔ قینچی
۲۔ تہخدے خواب دی چھائی

تالیف و انتخاب

۱۔ نیرنگِ خیال کا اردو ماہیا نمبر
۲۔ چاک پہ رکھے خواب
۳۔ ۲۰۱۱ کی شاعری کا انتخاب
۴۔ منتخب کلامِ ناسخ



حیرت بڑی نعمت ہے اور خوش نصیب ہوتے ہیں وہ لوگ جنھیں چشمِ تحیر سے نوازا جائے۔ احمد حسین مجاہد کا شعری سرمایہ ''دھند میں لپٹا جنگل'' میرے لیے ایک خوش گوار حیرت کا سبب بنا۔ آغازِ سفرِ شعر میں اس سج دھج کی غزل اور بُنت کی ایسی پکی نظم لکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ پہلے مجموعے میں اکثر پاس اور دور کی آوازیں سنائی دیتی ہیں اور پر چھائیاں دکھائی دیتی ہیں مگر حمد کے مطلع سے لے کر الوداعیہ نظم کے آخری مصرعے تک ایک تازہ کار اور تازہ نفس تخلیق کار کی آمد آمد کی گونج سنائی دیتی ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ توفیق میسر آئی ہے تو نوجوان نے شکر ادا کیا ہے اور کسبِ فن میں محنت وریاضت سے آگاہی کو بھی اپنے لیے لازم اور واجب جانا ہے۔ فارغ بخاری، خاطر غزنوی، احمد فراز، محسن احسان، ضیاالدین ضیا، سعید احمد اختر، سلطان سکون اور غلام محمد قاصر ہی کو نہیں ، ہم سب کو ''دھند میں لپٹا جنگل'' مبارک ہو جو ایک روشن تر اور تابناک روایت کی توفیق کی بشارت اور نوید لے کر آئی ہے۔ ساری اردو دنیا میں ''دھند میں لپٹا جنگل'' توجہ سے پڑھی جائی گی کہ یہ ایک بشارت سنانے والے اور تازہ تر امکانات کے دروازے پر دستک دینے والے شاعر کی ترجمانی کرتی ہے۔

افتخار عارف